محمد بلال رؤف ⁕

حیاتِ قابلؔ اجمیری: ایک جائزہ

The life of Qabil Ajmeri: An Overview

By *Bilal Rauf, Lecturer Urdu, Cadet College, Pitaro*

ABSTRACT

Qabil Ajmeri celebrated as the "Great Poet of a Young Age," was a pivotal figure in modern Urdu ghazal. Orphaned early in Ajmer Sharif (India), his literary foundation was built not on formal schooling, but on intense self-study within the rich, informal artistic environment of the Ajmer Dargah.

His life was dramatically defined by the 1947 Partition, forcing his migration to Karachi in 1948. As a Muhajir (migrant) in Pakistan, Qabil's poetry matured, becoming an eloquent chronicle of displacement (Gham-e-Hijrat) and existential struggle (Gham-e-Rozgar).

Qabil suffered from tuberculosis, and his brief career was plagued by ill-health and intense professional jealousy from peers in Hyderabad, Sindh. Qabil Ajmeri died in 1962 at the age of 33, joining the ranks of literary figures like Keats His work stands as a powerful testament to the anguish and resilience of the post-Partition generation, securing him a high place in the history of Urdu poetry.

Keywords: Qabil Ajmeri, Biographical Study, Culture Environment Ajmer, Sufi Influence, Migration & Trauma.

''چھوٹی عمر کا بڑا شاعر'' کا لقب پانے والے عظیم شاعر قابلؔ اجمیری کا اصل نام عبدالرحیم تھا۔ قابلؔ اجمیری ۲۷/اگست ۱۹۳۱ء میں اجمیر شریف کے محلے قصبہ چرلی (بھارت) میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد کا نام

⁕ لیکچرر اردو، کیڈٹ کالج، پٹارو

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

عبدالکریم اور والدہ کا نام گلاب بیگم تھا۔[۱] اس وقت اجمیر شریف میں دو اہم مہاجر طبقے اور ایک مقامی طبقہ پناہ گزیں تھا۔اول الذکر ان فوجی افسران اور نوابین کا طبقہ تھا، جو پٹھان سلطنت کے عہد میں یہاں آ کر آباد ہوئے۔ دوسری بڑی آبادی ان مقامی لوگوں کی تھی، جو خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے روضۂ اقدس کے مجاور اور خدمت گزار تھے۔تیسرا اہم طبقہ ان مہاجرین لوگوں کا تھا، جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد یوپی، دہلی اور اس کے گرد و نواح میں ہجرت کر کے آباد ہوئے۔ قابلؔ اجمیری کا خاندانی تعلق اول الذکران فوجی افسران، پیرزادہ یا دیس والیوں سے تھا، جو پٹھان سلطنت کے دور میں یہاں آ بسے تھے۔اس خاندان کے زیادہ تر لوگ اپنے وقت کے اعلیٰ فوجی عہدوں پہ مقرر تھے۔اس خاندان کو اجمیر اور اِندر کوٹ کے قرب میں کافی جائیداد ملی تھی،مگر قابلؔ تک آتے آتے بساط الٹ چکی تھی اور تمام جائیداد سمٹتے سمٹتے دو مکان تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ایک مکان ترپور گیٹ، اندر کوٹ میں واقع تھا، جو خواجہ معین الدین اجمیریؒ کی درگاہ سے منسلک تھااور دوسرا اجمیر شریف قصبہ چرلی کے نزدیک واقع تھا۔

قابلؔ اجمیری کے والد کا پیشہ تعمیرات کی ٹھکیداری تھااور اجمیر شریف کی متعدد مشہور و معروف عمارات ان کی زیرِ نگرانی بنیں،جس میں قابلِ ذکر عمارت ’’معینیہ اسلامیہ ہائی اسکول‘‘ ہے، جو مسلم تعلیم و تعلم کے حوالے سے پورے راجھستان میں بہت معروف درس گاہ ہے ۔ یہ درس گاہ بھی قابلؔ کے والد کے زیرِ نگرانی تعمیر ہوئی۔قابلؔ کے والد تپِ دق کے مریض تھے، جو اسی مرض کے سبب ۱۹۳۸ء میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔کچھ عرصہ بعد قابلؔ کی والدہ بھی اسی غم کو اپنے سینے سے لگائے اس دنیا سے کوچ کر گئی اور یوں قابلؔ اجمیری کے سر سے محض سات سال کی عمر میں والدین کا سایہ رخصت ہوگیا،قابلؔ کی ایک بہن نے بھی کم سنی میں وفات پائی،اور قابلؔ اجمیری اس بھری دنیا میں اکیلے رہ گئے۔اس ماحول میں قابلؔ کی پرورش کی ذمے داری آپ کے دادا اور دادی نے اٹھائی۔آپ کے دادا اجمیر ریلوے ورکشاپ میں پینٹر تھے۔[۲]

قابلؔ اجمیری نے اپنی ابتدائی تعلیم دارالعلوم معینیہ، درگاہ معلیٰ اجمیر شریف سے حاصل کی۔آپ نے چھ سال کی عمر میں صرف ونحو کا کورس مکمل کیا۔آپ نے ۱۹۴۱ء میں ابتدائی درجے کا امتحان پاس کیا۔ خالد مصطفیٰ نے قابلؔ اجمیری کی تعلیمی ریکارڈ کی وضاحت کچھ یوں دی ہے:

> آپ نے قرآن شریف میں ۹۰، اردو کی دوسری کتاب میں ۹۵،املا میں ۱۰۰، دینیات میں ۹۰ اور حساب میں ۱۰۰ نمبر حاصل کیے،اس طرح آپ نے ۵۰۰ میں ۴۷۵ نمبر حاصل کر کے امتحان اعلیٰ درجے میں پاس کیا۔[۳]

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

یہ بات نہایت دل چسپ اور قابلِ توجہ ہے کہ قابلؔ اجمیری نے اگرچہ کسی باقاعدہ مدرسے یا اسکول سے رسمی تعلیم حاصل نہیں کی، مگر ان کی فطری صلاحیتوں کی آبیاری اس ادبی و عملی ماحول نے بھرپور انداز میں کی جو ان کے گرد و پیش موجود تھا۔ اجمیر کا وہ معاشرتی اور ثقافتی پس منظر، جس میں شعری محفلیں، علمی نشستیں، اہلِ فن کی گفتگوئیں، اور ادبی ذوق رکھنے والے افراد کا آنا جانا روزمرہ کا معمول تھا، قابلؔ کے ذہن وقلب کے لیے ایک روشن منبعِ فیض ثابت ہوا۔ سید محمد تسلیم نے اپنے مقالے میں اس فضا کا نقشہ نہایت خوب صورتی سے کھینچتے ہوئے بتایا ہے کہ:

> قابلؔ اجمیری نے اجمیر کے جس ماحول میں آنکھ کھولی اس میں چاروں طرف علمی و ادبی سرگرمیاں عروج پر تھیں، مکان کے دروازے کے سامنے ڈھائی من کے جھونپڑے کی مسجد اور مدرسہ تھا جس کو سلطان شہاب الدین غوری نے اسلامی دنیا کی کی پہلی درس گاہ بنا کر پیش کیا تھا۔ ان کی مکان کی پُشت پر خواجہ معینؒ کی سنگِ مرمر کی تعمیر شدہ عظیم درگاہ تھی۔ جامعہ شاہجانی اور مدرسۂ نظامیہ اسی درگاہ کے احاطے میں واقع تھا۔ (۴)

قابلؔ اجمیری نے جب پڑھائی سے مکمل کنارہ کشی اختیار کی تو ان کی زندگی کا رخ ایک اور ہی سمت مڑ گیا۔ رسمی تعلیم سے دوری نے ان کے اندر کوئی خلا پیدا نہیں کیا، بلکہ وہ اپنا بیشتر وقت درگاہ کے اطراف قائم اُن چھوٹے بڑے ہوٹلوں میں گزارتے جہاں شعرا، قوال اور اہلِ فن جمع ہو کر علم و ادب کی وہ محفلیں آباد کرتے جن میں لفظوں کی خوشبو، فن کی گرمی اور روایت کی لطافت رچی بسی ہوتی تھی۔ اجمیر کے ذکی بازار اور درگاہ بازار کے یہی مقامات اس دور میں ادبی و روحانی سرگرمیوں کے ایسے مراکز تھے جہاں ہندوستان کے نام ور قوال سماع کے لیے آتے، اور محفلوں میں اردو و فارسی کے استادالشعرا کا کلام اس قدر سوز و جمال سے سناتے کہ سننے والوں کی روح تک مہک اٹھتی۔

قابلؔ اجمیری بھی انھی محفلوں کے مستقل بیٹھنے والوں میں شامل تھے۔ وہ امیر خسروؒ کے سوزِ نغمہ سے لے کر حافظ و سعدیؒ کی حکمت آشنا غزلوں تک، اور میرؔ، غالبؔ، مومنؔ و داغؔ دہلوی کے فنی نازکیوں سے مزین اشعار تک، ہر آواز اور ہر سخن کو پوری محویت کے ساتھ سنتے اور اپنے اندر جذب کرتے۔ یہ محفلیں ان کے لیے ایک غیر رسمی مگر نہایت مضبوط درس گاہ بن گئیں جنھوں نے ان کے فطری شعری ذوق کو روشن کیا۔ یہی وجہ ہے کہ رفتہ رفتہ وہ قوالوں سے سنا ہوا کلام یاد کرنے لگے، خود گنگنانے لگے، مصرعوں کو موزوں کرنے لگے، اور یوں سخن کا وہ چراغ ان کے دل میں روشن ہوا جس کی روشنی نے آگے چل کر انھیں اردو غزل کے ممتاز شعرا میں شمار کر دیا۔

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

قابلؔ اجمیری نے محض ۱۴ برس کی عمر سے ہی شاعری کا آغاز کیا، اور اصلاح کے لیے سب سے پہلے جس استاد کا انتخاب کیا وہ ارمان اجمیری تھے جو گڈری شاہ باباؒ کے سجادہ نشین تھے۔ ارمان اجمیری کی ملاقات نے قابلؔ اجمیری کی زندگی کو ایک نیا رخ دیا اور ان کو باقاعدہ شعروسخن کی طرف لے آئے، خوب محنت اور لگن نے قابلؔ اجمیری کو جلد استاد کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور قابل نے ارمان اجمیری کی بزم میں ایک فعال رکن کی حیثیت حاصل کر لی۔ ارمان اجمیری نے جہاں ان کی اصلاحِ سخن کی، وہیں ان میں خود اعتمادی پیدا کی، اسی سبب قابلؔ نے مقامی طرحی مشاعروں میں شریک ہونا شروع کیا اور اس کے علاوہ میونسپل ہال اور اسلامیہ ہوٹل میں ہونے والے کئی بڑے مشاعروں میں شرکت کی۔ قابلؔ اجمیری ترنم پر یقین نہیں رکھتے تھے، تحت اللفظ میں بھی کوئی کمال حاصل نہیں تھا، قابلؔ کا گلہ بھی رندھا ہوا تھا لیکن نئی آواز، اچھے اور منفرد اشعار کہنے کی بدولت جلد عوامی اور ادبی حلقوں میں خود کو منانے میں کامیاب رہے۔ قابل اجمیری تین سال تک ارمان اجمیری کے زیرِ سایہ مشقِ سخن کرتے رہے۔

قابلؔ کے ہم عصر شعرا پر اس دور کی عمومی یاسیت کی گہری چھاپ تھی؛ ادبی فضا مجموعی طور پر ایک گھٹن زدہ ماحول کی ترجمان نظر آتی تھی، جس کے زیرِ اثر شاعری کے مضامین بھی محدود اور یک رنگ ہو چلے تھے۔ یہی اثرات قابلؔ اجمیری کی ابتدائی شاعری پر بھی دکھائی دیتے ہیں، جہاں انھوں نے اپنے دور کے رائج اس اسلوب کو اختیار کیا جو محرومی، بے سمتی اور فکری اداسی کا آئینہ دار تھا۔ تاہم قابل کسی ایک طرز کے اسیر نہ تھے۔ انھوں نے اسی مروجہ رنگِ سخن میں ایک تازگی اور جدت پیدا کی۔ وہ جدت جس نے انھیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کر دیا۔[۵]

قابلؔ نے اپنے کلام میں جگرؔ مراد آبادی کی زبان کی شگفتگی، روزمرہ کی چہل پہل، اور محاورے کی برجستگی کو شامل کیا، جس سے ان کی شاعری میں ایک نیا حسن پیدا ہوا۔ یوں ان کے اشعار نہ صرف احساسات کی گہرائی لیے ہوئے تھے بلکہ زبان کی چستی، برجستگی اور تہذیبی جمالیات کا بھی خوب صورت امتزاج پیش کرتے تھے۔ یہی انفرادیت ان کے شعری سفر کی پہچان بنی اور انھیں گھٹن زدہ ادبی ماحول میں ایک تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند نمایاں کر گئی۔

فقط مری موت تک ہے قائم   یہ رنگِ رخ پر حجاب تیرا
اِدھر تو بندِ کفن بندھیں گے   اُدھر اُٹھے گا نقاب تیرا
جہاں کوند کر مسکراتی ہے بجلی   وہیں گھر بنانے کو جی چاہتا ہے
جتایا وہ احسان ہے ناخدا نے   کہ اب ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے[۶]

نصیر آباد میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس میں اجمیر شریف کی تمام ادبی تنظیموں کے شعراء نے شرکت کی، اس

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

میں بزمِ ارمان کے شعرا ءاور قابلؔ اجمیری بھی پیش پیش رہے۔مشاعرے میں بزمِ ارمان کے کچھ شریر طالبِ علموں نے شعراء پہ جملے کسے جس کے نتیجے میں افقؔ اجمیر کی معیت میں آنے والے شعراء نے بزمِ ارمان کے شعرا ءاور قابلؔ اجمیری پہ ہلہ بول دیا، اور مشاعرہ ادبی میدانِ جنگ کا منظر پیش کرنے لگا اور آگے چل کر یہی مشاعرہ ایک ملکی سطح کا ادبی تنازعہ بن گیا۔(۷) جب تنازعات سر اٹھاتے چلے گئے تو قابلؔ نے تنگ آ کر بزمِ ارمان سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور مولانا عبد الباری معنیؔ کے حلقۂ شاگردمیں داخل ہو گئے۔مولانا عبد الباری معنیؔ کے بارے میں خالد مصطفیٰ اپنی کتاب میں رقم طراز ہیں کہ:

> مولانا عبدالباری معنیؔ خانوادۂ چشتیہ کے نامورسپوت تھے،آپ عربی کے جید عالم اورقرآن و حدیث کے محقق تھے،اس کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔(۸)

قابلؔ اجمیری کوجوشاعری کے اندازِ بیاں کی نئے زاویے کی تلاش تھی، اور ایک قابل اصلاحِ سخن کی تلاش تھی وہ مولاناعبدالباری معنیؔ کے حلقۂ شاگردی میں مکمل ہوئی، اور مولانا کی شاگردی اختیار کرنے کے بعد وہ پختہ شعر کہنے لگے۔قابلؔ کے وسیع مطالعے کا ذریعہ بھی مولانا باری بنے۔اول تو مولانا عبدالباری بذاتِ خود ایک پیکرِعلم و ادب تھے اور دوسرا ان کا ایک کتب خانہ تھا جس میں ہزار ہا رسائل اور کم وبیش پانچ ہزار کتب کا ذخیرہ موجود تھا۔یہ کتب خانہ قابلؔ کے لیے بہت کار آمد ثابت ہوا اور اسی کتب خانے کی بدولت قابلؔ ایک نئی شعری دنیا سے متعارف ہوئے، اسی کتب خانے میں قابلؔ ''ترقی پسند شعرا'' کے کلام سے آشنا ہوئے اور شاعری کی معراج کو جانا۔ترقی پسندشعرا کے رنگِ سخن کی بدولت قابلؔ نے زندگی کے دوسرے رخ کو دیکھنا شروع کیا اورحلقۂ یاسیت و قنوطیت سے نکل کرطمانیت کی خوشگوار فضا میں سانس لینا شروع کیا۔(۹) اب قابلؔ کا طرزِ رنگِ سخن یہ تھا:

ان کی خوشی میں جان دوں اپنی خوشی خوشی
جیسے وہ ہیں خدا میں کوئی چیز ہی نہیں(۱۰)

آہستہ آہستہ اجمیر میں یہ بات تیزی سے پھیلی کہ افقِ اجمیر میں ایک اعلا پائے کا شاعر ابھر رہا ہے،جس کے کلام میں انفرادیت اور ایک خاص اسلوب نمایاں ہے،جس کے کلام میں طمانیت و رجائیت کی آمیزش موجود ہے جو زندگی سے دل برداشتہ ہونے کے باوجوداس سے مایوس نہیں۔قابلؔ اجمیری مولانا کو روز مشقِ سخن کے طور پر ایک غزل دکھاتے اور ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔مولانا باری پہلے ان کی غزل کو عروضی لحاظ سے پرکھتے اور بعد ازاں اس کے معنوی خصائص پہ گفتگو فرماتے،اس طرح بہت کم وقت میں قابلؔ کے کلام میں نکھار اور پختگی

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

آنے لگی۔

قابل اجمیری کا باقاعدہ شعری سفر ۱۹۴۴ء میں معینیہ ہائی اسکول اجمیر میں منعقدکُل ہند مشاعرے سے ہوا۔قابلؔ نے اپنے استاد مولانا عبد الباری معنیؔ کی بدولت اس مشاعرے میں شرکت کی،اس وقت تک قابلؔ اجمیری کی عمر تقریباً تیرہ یا چودہ سال تھی۔(۱۱) اس مشاعرے میں ہندوستان کے استاد شعرا جگرؔ مراد آبادی، ماہرؔ القادری، حفیظؔ جالندھری، سیمابؔ اکبرآبادی وغیرہ نے شرکت کیں اوران میں ایک نام قابلؔ اجمیری کا بھی تھا۔ قابلؔ نے اس مشاعرے میں مندرجہ ذیل غزل پڑھی:

اب یہ عالم ہے کہ غم کی بھی خبر ہوتی نہیں — اشک بہہ جاتے ہیں لیکن آنکھ تر ہوتی نہیں
پھر کوئی کم بخت کشتی نذرِ طوفاں ہوگئی — ورنہ ساحل پر اداسی اس قدر ہوتی نہیں
تیرا اندازِتغافل ہے جنوں میں آج کل — چاک کر لیتا ہوں دامن اور خبر ہوتی نہیں
میری نظریں جراتِ نظارہ کی مجرم سہی — احتیاطِ حسن تم سے بھی مگر ہوتی نہیں
رنگِ محفل چاہتا ہے، اک مکمل انقلاب — چند شمعوں کے بھڑکنے سے سحر ہوتی نہیں
اضطرابِ دل سے قابلؔ وہ نگاہِ بے نیاز — بے خبر معلوم ہوتی ہے مگرہوتی نہیں(۱۲)

قابلؔ اس مشاعرے کے بعدہندوستان میں مقبول عام ہوگئے اور خواص وعوام کی زبان پہ قابلؔ کے تذکرے دکھائی دینے لگے، قابلؔ اجمیری کو بیرونی مشاعروں سے دعوت نامے موصول ہونے لگے،آپ کا کلام ادبی جرائد میں شائع ہونے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے قابلؔ اجمیری کم عمری میں ہی اجمیر شریف کے مقبول ومعروف شاعر بن گئے۔

تم نہ مانو مگر حقیقت ہے
عشق انسان کی ضرورت ہے(۱۳)

ہرشاعر کی زندگی میں ایک تجربہ عشق کا ہوتا ہے،جس کے ذریعے وہ ہجر و وصال، جوش وجنوں، کیف وسرور جیسی کیفیات سے واقف ہوتا ہے۔ قابلؔ بھی اس نعمت سے محروم نہ رہے اور اس سادہ مزاج، خاموش طبیعت کو اپنے پڑوس کی ایک لڑکی سے عشق ہوگیا۔قابلؔ اجمیری کے پڑوس میں خطیب مولانا عبدالرحمٰن عربؔ رہتے تھے جن کے ہمراہ ان کی نہایت حسین وجمیل کڑیل جواں بیٹی بھی رہتی تھی،جس کا نام عطیہ تھا جو پہلے ہی قابلؔ کی شاعری کی گرویدہ تھی۔اس وقت قابلؔ بھی عمر کے اس حصہ میں تھے جب مزاج میں شوخی ورنگینی کا غلبہ ہوتا ہے۔ایک روز جب عطیہ قابلؔ کے گھر آئی ہوئی تھی،اسی وقت قابلؔ کی ایک نگاہ اس پر پڑی اور اس نگاہ میں عطیہ کے حسن وجمال

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

نے قابلؔ کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ محتاط فطرت ہونے کے سبب قابلؔ کبھی کھل کر اظہار نہ کر سکے اور عطیہ پرائی گھر کی ہوگئی۔ ڈاکٹر خالد مصطفیٰ اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> عرب صاحب سے قابلؔ کے لیے رشتہ مانگا گیا مگر وہ اس رشتے پہ راضی نہیں ہوئے۔ عبدالرحمٰن نے قابلؔ کو گود کھلایا تھا اور وہ اس کے نام و نسب بھی واقف تھے اس لیے ان کے پاس رشتے کو رد کرنے کا کوئی بہانہ نہ تھا مگر انھوں نے یہ کہ کر بات ٹال دی کہ قابلؔ بے روزگار ہے اور جب تک اس کا ذریعۂ معاش نہیں ہوتا میں اپنی بیٹی کا اس سے عقد نہیں کر سکتا۔ بعد ازاں جب عطیہ کے لیے عربؔ صاحب کے کسی عزیز کا مناسب رشتہ آیا تو انھوں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے بیٹی کی شادی کر دی اور یوں یہ قصہ تمام ہوا۔ (۱۴)

واقعہ زیادہ غم ناک نہ تھا مگر قابلؔ ایک حساس طبیعت کے ملک تھے اور پھر زندگی میں ان کے فردِ خاندان کی رخصتی، ساتھ ساتھ شجر ہائے سایہ دار کے سائیوں سے محرومی کا دکھ اور پھر عطیہ سے کی گئی ناکام محبت تو ایک ایک غم نے مل کر قابلؔ کی ذات کو غم کدہ میں تبدیل کر دیا اور قابل یہ کہتے کہتے ٹوٹ پڑے۔

کیا ہوا ہے کہ ترے عشق کا سودا بھی نہیں — زندہ رہنے کے لیے کوئی تمنا بھی نہیں
اس کڑے وقت میں بدلی ہیں نگاہیں تم نے — اب مجھے حوصلۂ ترکِ تمنا بھی نہیں
راہ پُر خار ہے اور رات اندھیری قابلؔ — دور تک کوئی چراغِ رخِ زیبا بھی نہیں (۱۵)

اس قدر بارِ الم اٹھانے کے باوجود قابلؔ کا حوصلہ پست نہ ہوا وہ زندگی سے مایوس نہیں ہوئے، قابلؔ غمِ روزگار و غمِ عشق کو سینے سے لگائے ایک قابل اور پُر اعتماد شخصیت بن کہ نمایاں ہوئے۔ اسی سبب ان کے وجود میں شعری شعلوں نے سر اٹھانا شروع کیا اور قابلؔ نے غمِ اندوہ کو ہی اپنا زادِ سفر بنا لیا لیکن یہ غم فانیؔ بدایونی کی طرح یاسیت بھرا نہ تھا نہ قنوطیت بھرا بلکہ قابلؔ کے نزدیک غم عارضی وقتی تکلیف و جذبے کا نام ہے جو انسان کو نزع سے دور اور حیات سے قریب لے جاتا ہے:

نہ گھبرا شبِ ہجر کی تیرگی سے — سحر بھی نمودار ہوگی اسی سے

ہر قدم پر حادثہ، ہر آرزو پر حادثہ — حادثے پھر بھی ہمارے حوصلوں سے کم رہے

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

وقت کا غم جو سل بھی جاتا ہے عمرِ رفتہ پلٹ بھی آتی ہے (۱۶)

پھر وقت نے کروٹ بدلی اور وہ سال سر پر آ کھڑا ہوا جسے قتل و غارت، عصمت فروشی، اپنوں سے جدائی اور اپنوں کے ہی ہاتھوں ہندوستان کے بٹوارے کا سال کہا گیا۔ وہ سال آن پہنچا جو ہجرت و کرب سے عبارت تھا، ہندوستان تقسیم کے دہانے پہ آ کھڑا ہوا اور مملکتِ خداد پاکستان کا ہیولہ پوری طرح عیاں ہو گیا تھا اور ۱۴ / اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آیا اور ملک آزاد ہو گیا لیکن یہ آزادی تقسیم کے زخمی گھوڑے پہ سوار ہم تک پہنچی۔ جس امید اور جس فکر پر ہم نے آزادی حاصل کی وہ ہمیں نصیب نہ ہوئی اور اس آزادی کی پہلی صبح ہی خون آلود ہو کر نمودار ہوئی۔

سال گزر رہا تھا اور جو آگ جل کر بجھ چکی تھی اور شعلے سرد پڑ چکے تھے مگر راکھ سے دھواں اب بھی اٹھ رہا تھا اور نقل مکانی اور پُرخوف و خطر ہجرتوں کا سلسلہ جاری و ساری تھا۔ راکھ سے اٹھنے والے دھواں نے زور پکڑا اور اچانک اجمیر میں ہندو مسلم فسادات کا شور اٹھا اور جس اجمیر میں ہندو مسلم (ہندوستانی قوم) کے اتحاد کی مثال دی جاتی تھی اسی اجمیر کی گلیوں میں مسلمانوں کے خلاف فلک شگاف نعرے بلند ہوتے دکھائی دیے۔ نعرے بازوں میں متعصب لوگوں کے علاوہ ان لوگوں کی آواز بھی ہم آہنگ تھی جو کبھی محبت و الفت اور بھائی چارے کا درس دیا کرتے تھے۔ آج وہی لوگ مسلمان کے خون کے پیاسے اور بنتِ مسلم کی عصمت دری کے متلاشی نظر آئے۔ اس صورتِ حال نے باشندگانِ اجمیر کو نقل مکانی اور ہجرت پر مجبور کر دیا اور۔ قابلؔ بھی اپنے بھائی کی ہمراہ ان ہی خانماں برباد مہاجروں کے ہمراہ ۱۹ دسمبر ۱۹۴۸ء کو اجمیر سے پاکستان جانے والے ایک قافلے کے ساتھ وطن روانہ ہوئے۔ (۱۷)

تمھیں خبر بھی ہے یارو کہ دشتِ غربت میں
ہم آپ اپنا جنازہ اٹھائے پھرتے ہیں (۱۸)

۱۹۴۷ء کے فسادات کے بعد قابلؔ اجڑے اور خانماں برباد قافلے کا ساتھ اجمیر سے ہجرت کر کے پاکستان کے شہر کراچی میں پہنچے، جو اس وقت ہندوستانی مہاجرین کی سب سے بڑی پناہ گاہ تھی۔ جہاں مہاجرین اپنے قیمتی اثاثے، املاک اور جائیداد کا کلیم (claim) حاصل کرتے (جو وہ ہندوستان چھوڑ آئے تھے) اور پاکستان میں ملنے والی متبادل جگہ جا کر آباد ہو جاتے۔ قابلؔ بھی ہندوستان میں اپنے آبائی علاقہ قصبہ چرلی میں (انڈیا) میں دو گھر چھوڑ کر آئے تھے مگر قابلؔ کو یہاں ان دونوں میں سے ایک کا بھی (claim) حاصل نہ ہو سکا۔ (۱۹) قابلؔ کے علاوہ بھی کئی مہاجرین کو ان کا حق نہیں ملا اور خدا کی بستی میں مہاجرین کا وہ استقبال نہیں ہوا جس کے وہ مستحق تھے۔ کچھ

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

عرصہ قابلؔ کیمپ میں رہے پھر تلاشِ روزگارو مکاں کے لیے خاک چھاننے نکلے، وہاں جہاں ان کو اپنے مکان کا بھی (claim) نہیں ملا۔ ہجرتِ پاکستان کے بعد قابلؔ کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے راشد ممتاز اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

> مہاجرین کلیم داخل کروا کہ مکان، دکانیں، زمینیں اپنے اپنے نام الاٹ کروا رہے تھے۔ لیکن اس قسم کے مادی فوائد حاصل کرنے کے لیے جس قسم کی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے، قابلؔ ان سے یکسر محروم تھے، ماہر القادری نے اپنے رسالے ''فاران'' کے دفتر میں سر چھپانے کی جگہ دی۔[۲۰]

یہ تھا قابلؔ اجمیری کا اپنی نئی زمین پر استقبال، ایک ایسا استقبال جس میں راحت یا آسودگی کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔ پہلے جس دل میں غمِ عشق اور غمِ ہجرت کا بوجھ تھا، اب وہاں غمِ روزگار نے مستقل ڈیرہ ڈال لیا تھا۔ پردیس کی مٹی میں قدم رکھتے ہی زندگی نے ان پر نئے امتحان مسلط کر دیے، اور معاش کی تگ و دو نے اُن کی سابقہ تمام کیفیات پر ایک نیا پردہ تان دیا۔ مگر قابلؔ وہ نہ تھے جو حالات کے تھپیڑوں سے شکست کھا جاتے۔ ان سب کڑواہٹوں، محرومیوں اور روزگار کی بے رحم جدوجہد کے باوجود ان کا حوصلہ متزلزل نہ ہوا۔ وہ مسلسل زندگی کے ناگفتہ بہ حالات سے لڑتے رہے، ہر نئے زخم کے باوجود کھڑے رہے، اور اسی بے خوفی نے انھیں نہ صرف مضبوط بنایا بلکہ ان کے شعری لہجے میں وہ وقار اور گہرائی بھی پیدا کی جو آگے چل کر ان کی شناخت بنی۔

قابلؔ اجمیری نے کچھ عرصہ ماہر القادری کے رسالے''فاران'' کے دفتر میں گزارے پھر کراچی سے حیدرآباد تشریف لے گئے، جہاں قابلؔ نے بھی دیگر مہاجرین کی طرح ایک سہ منزلہ عمارت میں قبضہ جمایا جو چھوٹی گھٹی میں واقع تھی۔ یہ عمارت تنگ و تاریک گلیوں کے درمیان واقع تھی۔ قابلؔ چوں کہ مجلسی آدمی تھے. جن کا اٹھنا بیٹھنا لوگوں کے درمیان تھا، اسی سبب قابلؔ نے وہ گھر چھوڑ کر گرو سنگت کی عمارت کے ایک خالی کمرے میں قیام کیا، اسی کمرے میں قابلؔ نے ادبی تخلیقات کے نئے نئے جواہر تراشے اور ایسی ایسی غزلیں کہیں جو عروسِ ادب کا سہاگ سمجھی گئیں۔

پاکستان میں قابلؔ کی مقبولیت حیدرآباد سندھ مشاعرے سے شروع ہوئی، جہاں جگرؔ مرادآبادی نے خود قابلؔ کا ایک شان دار تعارف کروایا تھا۔ حیدرآباد منتقلی کے بعد قابلؔ نے مخدوم محمد یوسف اور ڈاکٹر نامی کی مدد سے ایک شان دار ہفتہ وار روزہ ''شاہین'' کا اجرا کیا جس کے بہ مشکل چند ہی شمارے جاری ہو سکے اور اس کی وجہ قابلؔ کی خاندانی بیماری یعنی تپ دق بنی۔ قابلؔ اجمیری برسرِ مکان ہونے کے بعد تلاشِ روزگار کے لیے نکلے ہی تھے کہ ان

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

کی ملاقات پیکر واسطی سے ہوئی جو قابلؔ کے ایک دیرینہ دوست تھے، جو اس وقت روزنامہ ''جاوید'' کے چیف ایڈیٹر تھے، پیکر واسطی چوں کہ قابلؔ کی شاعری سے بہت متاثر تھے تو انھوں نے قابلؔ کو روزنامہ ''جاوید'' میں قطعہ نویسی کی پیشکش کی، جس کو قابلؔ نے بہ خوشی قبول کیا اور یوں قابلؔ برسرِ روزگار بھی ہوگئے۔ قابلؔ کے بلاناغہ روزنامہ ''جاوید'' اور ''آفتاب'' میں قطعے شائع ہونے لگے اور اس کے عوض قابلؔ کو معقول معاوضہ ملنے لگا۔(۲۱)

روزنامہ ''جاوید'' اور روزنامہ ''آفتاب'' کی بہ دولت قابلؔ اجمیری کی تخلیقات ہر خواص وعوام تک پہنچ چکی تھیں اور قابلؔ ایک اچھے شاعر کے طور پر پہچانے جانے لگے، اب وہ صرف حیدرآباد کے شاعر ہونے کے بہ جائے وادیِ مہران کے شاعر بن گئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے قابلؔ جدید اردو غزل کے نمائندہ شاعر بن گئے اور سندھ بھر کے نامور شعرا کی نمائندگی کرنے لگے، اب قابلؔ کی شاعری کے پاکستان کے علاوہ ہندوستان میں بھی ڈنکے بجنے لگے۔ استاد شعرا اخترؔ انصاری، جگرؔ مرادآبادی، سیمابؔ آکبرآبادی جیسے مشاہیرِ علم وفن ان کے کلام کی داد دیتے دکھائی دیے اور حمایت علی شاعرؔ جیسے لائق شاگرد ان کے شاگرد بنے۔ قابلؔ کو محض ۲۱ سال کی عمر میں ہی اردو کے سینئر شاعر ہونے کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔(۲۲) یہ قابلؔ کا باحیثیت شاعر ایک سنہری دور چل پڑا تھا اب قابلؔ ضرورتِ زندگی کے اعتماد پہ جینے لگے۔

جی رہا ہوں اس اعتماد کے ساتھ
زندگی کو مری ضرورت ہے(۲۳)

لیکن قابلؔ اجمیری کو شاید دل کے کسی کونے میں یہ احساس پہلے ہی سے تھا کہ زندگی انھیں زیادہ دیر خوش رکھنے والی نہیں۔ غمِ عشق، غمِ ہجرت اور غمِ روزگار کے بے شمار زخموں اور تکالیف سے گزر لینے کے باوجود بھی زمانے نے ان پر مہربانی کے در نہ وا کیے۔ گویا عرصۂ حیات نے انھیں کبھی پوری طرح سانس لینے کی مہلت نہ دی۔ حالات نے بارہا ان کا راستہ روکا، اور زندگی نے ہر موڑ پر انھیں کسی نہ کسی نئے حادثے کی زد میں رکھا۔ ان کا شعر ہے کہ:

لاکھ ہم خانماں خراب سہی
حادثوں کی نظر میں رہتے ہیں(۲۴)

مگر یہ سب کچھ سہتے ہوئے بھی قابلؔ اجمیری نے صبر وحوصلے اور ہمت کا دامن نہیں چھوڑا، قابلؔ اجمیری ہر صدمے کے بعد پھر اٹھے، اور پھر زندگی کی اسی تپتی دھوپ میں نئے عزم کے ساتھ آگے بڑھے۔

قابلؔ اجمیری کی بیماری سے خواص وعوام سب ہی واقف تھے۔ حلقۂ احباب نے قابلؔ اجمیری کی بیماری کے علاج کے لیے حکمران طبقے اور صاحبِ ثروت افراد سے امداد کے لیے اخبار و رسائل میں پے در پے درخواستیں

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

شائع کیں۔اخباری مطالبات سے مجبور ہوکر وزیرِ صحت ِ سندھ جناب پیر محمد علی راشد نے سولہ ہزار علاج کے خرچ کے لیے امداد منظور کی اور ساتھ ساتھ قابلؔ اجمیری کو اعلا معیاری علاج کے لیے اٹلی بھیجنے کا اعلان کیا۔(۲۵) مگر اس نوٹس پہ عمل درآمد نہ ہوا اور ایسے کئی اعلانات ہوتے رہے، وزاتیں بدلتی رہیں، بنتی گئی اور ٹوٹتی رہیں مگر نتیجہ صفر رہا اور قابلؔ کے علاج کا درماں نہ ہوسکا اور قابلؔ یہ کہنے پہ مجبور ہو گئے؛

تمھیں خبر بھی ہے یاروں کہ دشتِ غربت میں
ہم آپ اپنا جنازہ اٹھائے پھرتے ہیں(۲۶)

ناکام امیدیں، بے سود دلاسے،کاروائیاں تو ایک طرف پاکستان میں غمِ روزگار نے بھی بدترین حالات پیدا کر دیے تھے،قابلؔ اجمیری ابھی منازلِ شہرت طے ہی کر رہے تھے کہ اپنے ہی ہم عصروں کے حسد و منافرت کی تیروں کی زد میں آ گئے،اور ان تیراندازوں میں ان کے دوست،شاگرد اور ہمنوا شامل تھے

ادبی معرکہ آرائیاں تاریخِ ادب کا حصہ رہی ہیں لیکن قابلؔ کے ساتھ جو ہوا وہ ادبی معرکے کہ زمرے میں نہیں آتا اسے اوچھے پن کا نشانہ بنایا گیا اور حاسدین نے اس بے ضرر شاعر کو مجبور کیا کہ وہ خون تھوکتے تھوکتے داعی اجل کو لبیک کہہ دے۔قابلؔ اجمیری کی بلند نامی پہ مقامی بزرگ شعرا خوف کھانے لگے اور اسے نیچا دکھانے کے لیے عامیانہ پن پہ اتر آئے۔ایک واقعے کی تفصیل بتاتے ہوئے محسن بھوپالی اپنے مضمون ''یادیں'' میں لکھتے ہیں کہ:

> مجھے اچھی طرح یاد ہے مشاعرہ شباب پہ تھا کی اچانک صدر مشاعرہ نے مائک سنبھالا اور ایک رندھی ہوئی آواز نے فضا میں سوگواری کی سی فضا پیدا کر دی۔ حضرات میری صدارت پر میرے ایک ہم عصر شاعر کو اعتراض ہے،اس لیے منتظمین کے کہنے پر صدارت سے دست بردار ہوتا ہوں اور میں گھر جا رہا ہوں، آخری فقرہ درد کی گہرائیوں میں ڈوب چکا تھا۔ سامعین ششدر رہ گئے، مشاعرے پر چند ثانیوں کے لیے سناٹا چھا گیا، قابلؔ اجمیری اسٹیج سے اتر کر بھاری قدموں سے دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ جیسے یہ میری توہین ہے،ایک شاعر کی توہین ہے۔ میں تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا اور میں نے قابلؔ صاحب کا ہاتھ تھام لیا۔ چند لمحوں بعد قابلؔ صاحب مسندِ صدارت پر تھے۔(۲۷)

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

اسی مضمون میں آگے چل کر محسن بھوپالی ایک تنقیدی نشست کا حال لکھتے ہیں کہ:

مجھے وہ تنقیدی نشست بھی یاد ہے جہاں شہر کے منتخب ادیب اور شعرا جمع تھے، قابلؔ صاحب نے بھی وہاں اپنی ایک غزل تنقید کے لیے پیش کی اور جہاں ایک شاعر اور ان کے ساتھیوں نے تابڑ توڑ حملے کر دیے، جوشِ تنقید میں نہیں بلکہ جوشِ تنقیص میں۔ قابلؔ کے ایک شعر کو جوں کا توں باقیؔ صدیقی کا شعر بتا گئے اور اس طرح قابلؔ صاحب کا دل توڑ کر رکھ دیا حالاں کہ بعد میں تحقیق سے پتا چلا کہ باقیؔ نے اس طرح میں کوئی شعر نہیں کہا۔ (۲۸)

حساس طبیعت، نحیف البدن، غریب اور طبیعتِ شرافت کا مالک کیا کسی کا گریبان پکڑتا۔ قابلؔ نے کسی قسم کا کوئی بدلہ نہ لیا اور اسی سبب لوگوں کے حوصلے بلند ہوتے چلے گئے اور قابلؔ اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں طنز و تنقیص کا نشانہ بنے رہے۔ قابلؔ کے حلقۂ احباب میں ایک نمایاں نام حمایت علی شاعرؔ کا بھی تھا، لیکن افسوس حمایت علی شاعرؔ بھی اس بے بس اور بیمار شاعر کے مخالفین کی صف میں نظر آئے۔ حمایت علی شاعرؔ کو سرکاری ملازم ریڈیو پاکستان نے متکبر، خودغرض اور انا پرست بنا دیا تھا جس بنا پہ وہ کسی بھی شاعر کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور نہ ہی کسی کی عظمت کا اعتراف کرتے تھے اور اس وقت قابلؔ اجمیری کے نام کا ویسے ہی شہرہ تھا جس سے حمایت سمیت تمام شعرا خائف تھے، اور تمام ایک گروپ کی صورت میں قابلؔ کو تنقیص کا نشانہ بناتے۔ اسی طرح عبدالرحمان محسن بھوپالی کے مطابق فروری ۱۹۶۲ء کی نشریات میں قابلؔ اجمیری کو اپنا ہدف بناتے ہوئے ان کی غزلوں پر کڑی تنقید کی اور قابلؔ صاحب کو ایک ناکارہ شاعر کہا اور ان کی غزلوں کو ادبی سرقہ کہا جو انھوں نے اپنے خونِ جگر سے لکھی تھیں۔ (۲۹)

قابلؔ کے اپنوں نے ہی قابلؔ کے نشیمن پہ پے در پے وار کیے اور اسے اس ملک میں ہی اجنبی بنا دیا تھا، جہاں وہ اپنا سب کو چھوڑ کر آیا تھا اور خواجہ معین الدینؒ کے مزار پہ یہ کہہ کر آیا تھا کہ ''خواجہ صاحب اب میں اپنے ملک جا رہا ہوں جہاں میرے اپنے میری مسرتوں کا ساماں لیے ہوئے میری راہ تک رہے ہیں۔'' قابلؔ کو اس کا قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ وہ مسرتوں کی بہار چھوڑ کر میدانِ خارزار میں جا رہا ہے، جہاں اس کے نام نہاد اپنے سامانِ مسرت کے عقب میں طنز کے تیر لیے ہوئے اس کی کردار کشی کے منتظر کھڑے تھے۔ ان حالات نے قابلؔ کی روح میں غریب الوطنی کا احساس پیدا کر دیا اور قابلؔ کو اجمیر یاد آنے لگا، جہاں وہ خواجہ کی چھوکٹ پر بیٹھ کر سکونِ دل حاصل کرتا تھا، ہوٹلوں، مشاعروں اور اردو کے استاد شعرا کا کلام سنا کرتا اور گلیوں، بازاروں میں گنگناتا پھرتا

ISSN: 2519-6332 (Print),   ISSN: 2708-1915 (Online)

تھا۔اجمیر کی یاد جب ستانے لگی تو قابلؔ کی روح میں نغمۂ اجمیر پھوٹ پڑا۔ یادِ اجمیر نے جب ایک مجسم صورت اختیار کرلی تو ان کی زبانِ سخن پہ یادِ وطن رقصاں ہوئی:

یادِ وطن

فکرِ چمن نہ پوچھو   یادِ چمن نہ پوچھو
دیوانہ پن نہ پوچھو   اکثر فریب کھایا
اجمیر یاد آیا
خواجہ کا آستانہ   دربار خسروانہ
وہ جھالرے کا پانی   آبِ بقا کا ثانی
اجمیر یاد آیا
بچپن کا یار جانی   اب ہوگیا پرایا
معنیؔ ساآ ہ رہبر   ہاے نیازؔ اطہرؔ
اجمیر یاد آیا
اب کیا کہیں کہ دل پر   کس کس کا داغ کھایا
راتوں کی خامشی میں   تاروں کی روشنی میں
اجمیر یاد آیا
جب ابر مست چھایا   پیغامِ یار لایا
جب پھول مسکرایا   کوئل نے گیت گایا
اجمیر یاد آیا
بلبل نے جب پکارا   اک تیردل پہ مارا
جذبات کو ابھارا   غم کا غبار چھایا
اجمیر یاد آیا(۳۰)

قابلؔ اجمیری اب یادِ وطن کے سہارے جیتے تھے۔ وہی نغمۂ طرب، جس کا ایک ایک مصرع محبت، وابستگی اور بیتے ہوئے دنوں کی خوشبو سے لبریز تھا، فضا میں بجتے ہی ایک گہری اداسی بکھیر دیتا۔ یہ نغمہ کبھی ان کے لیے

سکون کا مرہم بن جاتا اور کبھی دل پر ایک تازہ چوٹ لگا دیتا۔

حادثاتِ زمانہ نے قابلؔ سے جینے کی ساری امید چھین لی تھی، اپنوں کے دلاسے اب اسے تکلیف دینے لگے تھے۔ احباب کی دعائیں بھی نشتر محسوس ہونے لگی کیوں کہ اس کی نظروں سے فریبی دنیا کا نقاب الٹ چکا تھا وہ لوگوں کی حقیقت جان چکا تھا۔ اس کے باوجود قابلؔ نے کوئی انتقامی قدم نہیں اٹھایا۔ اس کی خودداری اور بے نیازی نے اسے شکوۂ احباب نہیں کرنے دیا اور خیالِ احباب کی خاطر قابلؔ نے چپ سادھ لی اور اپنوں سے ملے زخموں کا شمار کرنا چھوڑ دیا۔

خیالِ خاطرِ احباب اور کیا کرتے
جگر پہ زخم بھی کھائے شمار بھی نہ کیا[۳۱]

خاطرِ احباب نے قابلؔ کو مجلسی دنیا سے کنارہ کشی پہ مجبور کر دیا اور اسے تنہائی پسند بنا دیا۔ دوست، احباب کی اس رویے نے قابلؔ کو یہ کہنے پہ مجبور کر دیا:

ضبطِ غم کا صلہ نہ دے جانا   زندگی کی دعا نہ دے جانا
بے کسی سے بڑی امیدیں ہیں   تم کوئی آسرا نہ دے جانا
کوئی احسان کر کے قابلؔ پر   دوستی کی سزا نہ دے جانا[۳۲]

۱۹۶۰ء تک آتے آتے تپ دق کے مسلسل حملوں نے قابلؔ کو نڈھال، بے بس اور لاچار بنا دیا تھا اور وہ بسترِ مرگ پر اپنی موت کے انتظار میں آخری سانسیں گننے لگے تھے۔[۳۳] قابلؔ کو اس بات کا شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ آج وہ اس حالت میں بیماری کے سبب نہیں بلکہ اپنے حلقۂ احباب کی عنایت و سوغات کی بدولت ہے۔

کچھ غمِ زیست کا شکار ہوئے
کچھ مسیحا نے مار ڈالے ہیں[۳۴]

تپ دق کے مسلسل وار کے بعد قابلؔ کو بلوچستان کے دارالحکومت کوئٹہ میں فاطمہ جناح سینی ٹوریم ملٹری ہسپتال میں داخل کیا گیا ۳۵۔ جہاں قابلؔ کی زندگی نے ایک نئے سفر کا آغاز کیا۔ مایوسی سے نکل کر امیدوں بھری پر بہار فضا کا سفر۔ قابلؔ اجمیری کو اسپتال کے جس وارڈ میں رکھا گیا، اس وارڈ کی کیئر ٹیکر ایک عیسائی خاتون نرگس تھی۔ جن کا شمار غائبانہ قابلؔ کے مداحوں میں سے تھا۔ جناب ڈاکٹر ساجد امجد نے ''قضیہ قابلؔ'' میں قابلؔ اجمیری اور نرگس کی پہلی ملاقات کا ذکر کچھ یوں کیا ہے:

قابلؔ قہقہے کی آرزو میں خواجہ کی نگری اجمیر سے پاکستان آیا تھا اور اب وہ سینی ٹوریم

اسپتال میں کھانسی کی آوازیں سن رہا تھا۔ اس کا کوئی بھی تو نہیں تھا جو اس وقت اس کے سرہانے ہوتا۔ اسے دلاسے دیتا۔ اس کی ڈھارس بندھاتا۔ اسے آج بہت دن بعد اپنے ماں باپ یاد آئے، دادا دادی کا خیال آیا، خواجہ کا روضہ یاد آیا۔ معلوم نہیں وہ اب دوبارہ وہاں جانا نصیب ہوگا یا نہیں اس کی آنکھیں بھگ گئی۔

''اب کیسی طبیعت ہے۔'' کسی نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ قابلؔ نے آنکھیں کھولی کر دیکھا۔ نرس تھی جو اسے دیکھنے آئی تھی۔ جواب میں قابلؔ مسکرا کر رہ گیا۔ نرس نے ٹمپریچر لیا، سانس کی رفتار گنی، ''اب تو آپ کی طبیعت بہت بہتر ہے۔'' نرس نے قابلؔ سے مسکرا کر کہا، قابلؔ پھر مسکرا دیا۔

''جو شخص مسکرا سکتا ہے، وہ زندگی کے قریب ہوتا ہے۔ آپ مسکرا سکتے ہیں بڑی اچھی بات ہے مگر کچھ بولا بھی کیجیے۔ باتیں کرنے کا نام زندگی ہے۔'' نرس نے رپورٹ کارڈ پر کچھ لکھتے ہوئے کہا، ''میں پھر آؤں گی اور ڈھیر ساری باتیں آپ سے کروں گی۔''(۳۶)

یہاں سے قابلؔ نے زندگی کی ایک نئی راہ اختیار کی، جس میں اس کے ساتھ نرگس تھی۔ شاید نرگس نے لمحۂ قبولیت میں خداوند تعالی سے بصد خلوص و عاجزی سے دعا کی ہوگی، جس کے ثمر میں نرگس کو قابلؔ اجمیری ملے۔ عالمِ ارض و سماں اس حسین اور دلکش منظر کو اپنی ہتھیلی پہ لیے ہونٹوں پہ دل فریب تبسم بکھیری دیکھ رہے تھے۔ اس وقت اس وارڈ میں ایک کے بجائے دو مریض موجود تھے۔ ایک مریضِ جسم وجاں تھا اور دوسرا مریض، مریضِ عشق و الفت۔ ڈاکٹروں نے قابلؔ کے مرض کو لاعلاج اور ناممکن بتایا لیکن ساتھ ہی عرصۂ حیات کو کشادہ کرنے کی ایک امید دی کہ قابلؔ کے اطراف کے ماحول کو خوشگوار رکھ کر قابلؔ کو اس مرض سے دور لایا جا سکتا ہے۔ نرگس جو محظ ایک کیئر ٹیکر تھی قابلؔ کے غم سے آشنا ہو کر نفسیات داں بن گئی اور جان گئی کہ قابلؔ کے دامن میں غمِ دوراں کے سوا کچھ اور نہیں۔ پیکرِ ایثار نرگس نے قابلؔ کو مایوسی کے گہرے سمندر سے نکال کر امیدوں کے سرسبز میدانِ حیات میں لے آئیں۔ نرگس کی محنت رنگ لائی اور قابلؔ تیزی سے صحت یاب ہونے لگے۔

دشتِ الفت کے یہ دونوں پھول، پیکرِ عشق و محبت منزل کے جس موڑ پہ ٹکرائے وہیں سے انھوں نے حیاتِ نو کا آغاز کیا اور بچھڑنے کے تمام راستے بند کر کہ زندگی کو ایک دوسرے کے نام وقف کرنے کا عزم کیا۔ اس ملاقات سے قابلؔ کی زندگی نئی فضا کی ایک نئے لمس سے آشنا ہوئی جس نے زندگی کی رمق بڑھا دی تھی اور اسے یہ محسوس

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

کروایا کہ زندگی بہت حسین ہے۔ نرگس نے قابل ؔکو شادی کی پیش کش کی، (یہ جانتے ہوئے بھی کہ قابلؔ پہ عرصۂ حیات تنگ ہے، نہ اس کے پاس بنک بیلنس نہ کوئی جائیداد نہ ہی کوئی سرکاری ملازمت، قابلؔ محض ایک شاعر ہے وہ بھی اردو زبان کا) جس کو قابلؔ نے کچھ ہچکچاہٹ کے بعد نرگس کو ہامی بھر دی اور پھر اس نیلی آنکھوں والی عیسائی لڑکی نے اسلام قبول کیا اور قابلؔ کی دلہن بن گئی۔[۳۷] قابلؔ جیسی خوددار شخصیت نے لاکھ کہا ہوگا؛

کوئی احسان کر کے قابلؔ پر
دوستی کی سزا نہ دے جانا[۳۸]

مگر زہے نصیب کہ نرگس قابلؔ کے کہنے سے قبل ہی حرمِ دل میں قابلؔ کا مجسمہ نصب کر چکی تھیں اور اس پر اپنی سانسوں کا مقدس غلاف چڑھا چکی تھیں۔ قابلؔ کو بھی پھر اپنی خودداری کے ہتھیار ڈالنے پڑے اور اس کی دوستی کو قبول کرنا پڑا۔ قابلؔ صحت یاب ہونے کے بعد اپنی بیوی نرگس کے ہمراہ کوئٹہ سے حیدرآباد تشریف لے آئے اور سرفراز کالونی والے مکان میں رہنے لگے۔ قابلؔ کو خدا نے چمنستان زندگی میں ایک پھول عطا کیا جس کا نام ''ضمیر روشن'' رکھا گیا۔[۳۹] کچھ وجوہات کی بنا پہ قابلؔ کے بیٹے کا نام قابلؔ کی وفات کے بعد بدل کر ''ظفر قابلؔ'' کر دیا گیا)۔ قابلؔ اس پھول کی بس ایک ہی بہار دیکھ سکے۔

موت کو قابلؔ کی حیاتِ نو کی خوشیاں راس نہ آئیں، مسرتوں کے خزانے اس سے دیکھے نہ گئے جب کہ قابلؔ مسرتوں کے تمام خزانے عرصۂ دراز پہلے ہی لٹا چکے تھے لیکن زندگی علاجِ تنگئ داماں نہ کر سکی اور روحِ قابلؔ کو ہی وجودِ قابلؔ سے چرا لے گئی۔ قابلؔ اجمیری نے بھی زندگی کا قرض ادا کرتے ہوئے اپنی روح فرشتۂ اجل کو اس وقت حوالے کی جب ان کا پھول ''ظفر قابل'' محض ایک برس کا تھا۔ ڈاکٹر ساجد قابلؔ کی موت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ؛

> اس روز اس کے بیٹے کی سال گرہ تھی۔ دونوں میاں بیوی بہت خوش تھے۔ ان کی ہنسی اور بچے کی معصومیت سے گھر سجا ہوا تھا کہ اچانک قابلؔ کی طبیعت بگڑ گئی۔ پھیپھڑوں نے خون اگل دیا۔ بے یاروں مددگار نرگس نے ان کے دوستوں کو اطلاع دی اور خود اسپتال کی جانب دوڑی تاکہ ایمبولینس منگوائی جا سکے۔ وہ گھر پہنچی تو قابلؔ کی حالت بہت نازک تھی چند دوست بھی پہنچ چکے تھے۔ دوستوں نے اسے اسپتال لے جانے کے لیے ہاتھوں پر اٹھایا لیکن دوست اتنے گھبرائے ہوئے تھے کہ قابلؔ ان سے سنبھل نہ سکے اور زمین پہ آ گرے۔ اس نے بے بسی

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

> سے دوستوں کی جانب دیکھا پھر بیوی سے زیرِ لب کچھ کہا اور بے ہوش ہو گئے اسے سول اسپتال حیدرآباد میں داخل کر دیا گیا تھا، لیکن دشمنوں کے نشتر بیوی کی دلجوئی سے زیادہ کاری ثابت ہوئے۔ ۳۱/اکتوبر ۱۹۶۲ء کو صرف ۳۳ سال کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا علیہ راجعون۔ (۴۰)

تمام عمر حادثاتِ زندگی سے لڑنے والا شخص آج موت کے ہاتھوں ہار چکا تھا۔ قابلؔ کا لاشہ اس دنیا کی منافرت اور خاطرِ احباب پہ مسکرا رہا تھا۔ اس کے سرہانے اس کی بیوی ہی تھی جو اس کی لاش پہ آنسوں بہا رہی تھی اور اس کا ایک سال کا بچہ جو باپ کی شفقت اور عنایت سے محروم ہو کر یتیم ہو چکا تھا۔ دور کھڑی اردو غزل ماتم کناں تھی کہ وہ ایک عظیم غزل گو سے محروم ہو چکی تھی۔ قابلؔ کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے سید محمد تسلیم نے مقالہ میں لکھا ہے:

> قابلؔ صاحب کا جنازہ احباب کی خواہش کے مطابق گروسنگت لے جایا گیا۔ اس کمرے میں غسل دیا گیا جہاں انھوں نے زندگی کے پندرہ سال گزارے۔ جامع مسجد کے پیش امام نے نماز جنازہ پڑھائی۔ یہ وہی پیش امام تھے جنھوں نے مدرسۂ عثمانیہ کے مکتب میں قابلؔ صاحب کو باقاعدہ بغدادی پڑھا کر تعلیم کی ابتدا کی تھی۔ رات کے دس بجے جنازہ ہالہ روڈ کے قبرستان کی طرف روانہ ہوا۔ (۴۱)

۳۱/اکتوبر ۱۹۶۲ء کے دن سخن وارانِ حیدرآباد پہ غم ورنج کے بادل اُمڈ آئے جب ایک درد آشنا، با کمال شاعر قابلؔ اجمیری اپنے زخمِ جگر سے لہو کی بہاریں دکھا تا داعی اجل کو لبیک کہہ گیا اور فضائے شعر وسخنِ حیدرآباد کو سوگ وار کر گیا۔ قابلؔ اجمیری کی شاعری نے اسے دنیا کے دیگر ممتاز، با کمال شعرا، فن کاروں اور دنیا کو بے مثال و لاجواب تخلیقات عطا کرنے والوں کی صف میں شامل کر دیا۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ نے اس ضمن میں کیا خوب لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

> Keats died of consumption before he had complete his 26th year, and is therefore, in shelly's phrase, one of "the inheritors of unfulfilled renown," wrote william Henry Hudson in An outline history of English literature of John Keats who, in Hudson's words, was "the most romantics of the romantics poets" Josn Keats was not the only writer consumed by consumption, or galloping consumption, as TB or Tuberuculosis is often referred to. A host of western writers fell victim to consumption, including great names such as Tobert Louis Stevenson, Henry David Thoureau,

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

the Bronte sisters, George Oewell, Franz Kasfka and the list goes on. Qabil Ajmeri was one if the poet of urdu who succumbed to the diseases, like Keats, he too died young.(42)

قابلؔ صاحب کی پوری زندگی پر نظر دوڑانے سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح نمایاں ہوتی نظر آتی ہے کہ وہ محض ایک شاعر ہی نہیں بلکہ المیوں، داخلی و خارجی مشاہدات اور باطنی تجربات سے گندھی ہوئی ایک مکمل تخلیقی شخصیت کا پیکر تھے۔ یتیمی کی محرومیاں ہوں یا نوجوانی کا ناکام عشق، یا تقسیمِ ہند کے زخم یا دوستوں سے ملے طنز و تیر، ہر غم، ہر حادثہ اور ہر واردات ان کی شخصیت میں جذب ہو کر ایک فنّی اظہار میں ڈھلتی گئی۔ قابلؔ اجمیری نے اپنے دور کی یاسیت کو محض دہرایا نہیں بلکہ اس میں طمانیت، رجائیت اور زندگی کی حرارت کا نیا زاویہ پیش کیا۔ استاد شعرا کی صحبت، اجمیر کا علمی و روحانی ماحول، درگاہ کی محفلیں اور ترقی پسند شعرا کے فکری اثرات، یہ سب عوامل ان کی فکر و فن کی تشکیل میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ قابلؔ اجمیری کی شاعری زبان کی شگفتگی، جذبے کی شدت، اظہار کی تازگی اور تخیل کی وسعت کے باعث اپنے معاصرین میں ایک منفرد و اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔ قابلؔ کی غزل نہ صرف ان کے داخلی کرب کا آئینہ ہے بلکہ زندگی سے وابستگی، حسنِ نظر اور انسانی حساسیت کا ایک روشن اور معتبر حوالہ بھی ہے۔ قابلؔ اجمیری کی زندگی دراصل جدوجہد، جمالیاتی وجدان، اور حوصلے کی وہ داستان ہے جس نے قابلؔ کو اردو شعر و ادب میں ایک منفرد و اعلا مقام عطا کیا اور ''چھوٹی عمر کا بڑا شاعر'' ہونے کے استحقاق تک پہنچایا۔

حواشی

۱۔ وحید الرحمٰن خان، ''قابلؔ اجمیری: شخصیت و فن'' مقالہ برائے ایم اے اردو (۱۹۹۲ء۔۱۹۹۴ء)، مملوکہ یونی ورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، ص ۱۰

۲۔ ڈاکٹر امجد ساجد، ''جوہرِ قابلؔ''، ماہنامہ ''سرگزشت''، کراچی، شمارہ اکتوبر ۱۹۹۲ء، شمارہ نمبر ۱۲، جلد نمبر ۲، ص ۲۲

۳۔ خالد مصطفیٰ، ''قابلؔ اجمیری: شخصیت و فن''، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۷ء)، ص ۱۵

۴۔ سیّد محمد تسلیم، ''قابلؔ اجمیری: حالاتِ زندگی اور شاعری''، مقالہ برائے ایم اے اردو (۶۶۔۱۹۶۷ء)، مملوکہ جامعہ سندھ، جام شورو، ص ۱۳۔۱۴

۵۔ ڈاکٹر امجد ساجد، ''جوہرِ قابلؔ''، ص ۳۵

۶۔ ایضاً، ''قضیہ قابلؔ''، مشمولہ ''کلیاتِ قابلؔ''، (کراچی: فرید پبلشرز، ۱۹۹۴ء)، ص ۳۱۹

۷۔ ایضاً، ص ۳۰۲ تا ۳۳۵

۸۔ خالد مصطفیٰ، ''قابلؔ اجمیری: شخصیت و فن''، ص ۲۱

۹۔ ڈاکٹر ساجد امجد، ''قضیہ قابلؔ''، ص ۵

۱۰۔ ایضاً

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

۱۱۔ خالد مصطفیٰ، ''قابلؔ اجمیری: شخصیت وفن''، ص ۱۸
۱۲۔ سیّد حسین فرید، ''کلیاتِ قابلؔ''، (کراچی: فرید پبلشر، ۱۹۹۴ء)، ص ۵۸۔۵۷
۱۳۔ ایضاً
۱۴۔ خالد مصطفیٰ، ''قابلؔ اجمیری: شخصیت وفن''، ص ۱۹
۱۵۔ سیّد حسین فرید، ''کلیاتِ قابلؔ''، ص ۹۷
۱۶۔ ایضاً، ص ۔ ۹۵
۱۷۔ عمران عاکف خان، ''جدید اردو غزل میں قابلؔ اجمیری کا مقام'' مقالہ برائے پی ایچ ڈی (۲۰۲۰ء)، مملوکہ جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، نئی دہلی، ص ۱۶
۱۸۔ سیّد حسین فرید، ''کلیاتِ قابلؔ''، ص ۱۹۵
۱۹۔ عمران عاکف خان، ''جدید اردو غزل میں قابلؔ اجمیری کا مقام''، ص ۱۶
۲۰۔ ممتاز راشد، ''صفحۂ قابلؔ اجمیری''، ممبئی، ۲۶/جنوری، ۲۰۱۱ء، ص ۱
۲۱۔ ایضاً، ص ۲
۲۲۔ عمران عاکف خان، ''جدید اردو غزل میں قابلؔ اجمیری کا مقام''، ص ۲۲۔۲۳
۲۳۔ سیّد حسین فرید، ''کلیاتِ قابلؔ''، ص ۳۷
۲۴۔ ایضاً، ص ۱۸
۲۵۔ پروفیسر رضا ارشد، ''تعارفِ قابلؔ اجمیری''، مشمولہ ''اظہار عالمی مشاعرہ''، ۲۰۱۳ء بیادِ قابلؔ اجمیری، بحرین، ص ۱۸
۲۶۔ سیّد حسین فرید، ''کلیاتِ قابلؔ''، ص ۱۹۵
۲۷۔ محسن بھوپالی، ''چند یادیں'' مشمولہ ''طالب علم'' ڈائجسٹ، حیدرآباد، شمارہ فروری ۱۹۷۰ء، قابلؔ نمبر، ص ۱۰۱
۲۸۔ ایضاً
۲۹۔ ڈاکٹر امجد ساجد، ''جوہرِ قابلؔ''، ص ۳
۳۰۔ سیّد حسین فرید، ''یادِ وطن'' مشمولہ ''کلیاتِ قابلؔ''، ص ۲۸۶۔۲۸۷
۳۱۔ ایضاً، ص ۱۱۵
۳۲۔ ایضاً، ص ۴۲۔۴۳
۳۳۔ ڈاکٹر امجد ساجد، ''قضیۂ قابلؔ''، مشمولہ ''کلیاتِ قابلؔ''، ص ۲۳۷
۳۴۔ سیّد حسین فرید، ''کلیاتِ قابلؔ''، ص ۱۷۴
۳۵۔ خالد مصطفیٰ، ''قابلؔ اجمیری شخصیت وفن''، ص ۲۳
۳۶۔ ڈاکٹر امجد ساجد، ''قضیۂ قابلؔ''، ص ۳۴۰ تا ۳۳۹
۳۷۔ ایضاً، ص ۳۴۱
۳۸۔ سیّد حسین فرید، ''کلیاتِ قابلؔ''، ص ۴۲
۳۹۔ سیّد محمد تسلیم، ''قابلؔ اجمیری حالاتِ زندگی اور شاعری'' مقالہ برائے ایم اے اردو ۶۶۔۱۹۶۷ء) مملوکہ جامعہ سندھ جام شورو حیدرآباد، ص ۷۴ تا ۷۶
۴۰۔ امجد ساجد ڈاکٹر، ''قضیۂ قابلؔ''، ص ۳۴۹ تا ۳۴۸
۴۱۔ سیّد محمد تسلیم، ''قابلؔ اجمیری حالاتِ زندگی اور شاعری''، ص ۹۵

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

۴۲۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ، *Qabil Ajmeri: The inheritore of unfulfilled renown*، روزنامہ ’’ڈان‘‘، کراچی، اشاعت ستمبر ۲۰۰۸ء

مآخذ

۱۔ ساجد، امجد، ڈاکٹر، ’’قضیہ قابلؔ‘‘، مشمولہ ’’کلیاتِ قابلؔ‘‘، کراچی: فرید پبلشرز، ۱۹۹۴ء

۲۔ فرید، حسین، سیّد، ’’کلیاتِ قابلؔ‘‘، کراچی: فرید پبلشرز، ۱۹۹۴ء

۳۔ مصطفیٰ، خالد، ’’قابلؔ اجمیری: شخصیت وفن‘‘، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۷ء

جرائد و اخبارات

۱۔ روزنامہ ’’ڈان‘‘، کراچی، اشاعت ستمبر ۲۰۰۸ء

۲۔ ماہنامہ ’’سرگزشت‘‘، کراچی، شمارہ اکتوبر ۱۹۹۲ء، جلد، ۲، شمارہ نمبر ۱۲

۳۔ ’’طالب علم‘‘ ڈائجسٹ‘‘، حیدرآباد، شمارہ فروری ۱۹۷۰ء، قابلؔ نمبر

غیر مطبوعہ کام

۱۔ تسلیم، محمد، سیّد، ’’قابلؔ اجمیری: حالاتِ زندگی اور شاعری‘‘، مقالہ برائے ایم اے اردو، جامعہ سندھ، جام شورو، ۱۹۶۷ء

۲۔ خان، عمران عاکف، ’’جدید اردو غزل میں قابلؔ اجمیری کا مقام‘‘ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، نئی دہلی، ۲۰۲۰ء

۳۔ خان، وحید الرحمٰن، ’’قابلؔ اجمیری: شخصیت وفن‘‘ مقالہ برائے ایم اے اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی لاہور، ۱۹۹۴ء

Bibliography

1. Fareed, Hussain, Sayyid, *Kulliyat-e-Qabil*, Karachi: Fareed Publishers, 1994
2. Mustafa, Khalid, *Qabil Ajmeri: Shakhsiat-o-Fan*, Islamabad: Pakistan Academy of Letters, 2017
3. Sajid, Amjad, Dr., *Qazia-e-Qabil* in *Kulliyat-e-Qabil*, Karachi: Fareed Publishers, 1994

Magazines and Newspapers

1. Daily *Dawn*, Karachi, Sept. 2008

2, Monthly *Sarguzisht*, Karachi, Oct. 1992, Vol. 2, No. 12

3. *Talib-e-Ilm Digest*, Hyderabad, Feb. 1970, Qabil Number

Unpublished work

1. Khan, Imran Akif, Jadeed Urdu Ghazal mein Qabil Ajmeri ka Maqam, Dissertation for PhD, Jawar Lal Nehru University, New Delhi, 2020

2. Khan, Wahee-ur-Rahman, Qabil Ajmeri: Shakhsiat-e-Fan, Dissertation for MA Urdu, Oriental College, Punjab University, Lahore, 1994

1. Tasleem, Muhammad, Sayyied, Qabil Ajmeri: Halaat-e-Zindagi aur Shairi, Dissertation for MA Urdu, University of Sindh, Jam Shoro, 1967.